

”گھوڑا ہے..“

”کہاں؟“

”اوپر... قلعہ جنگی کے صحن میں..“

”وہاں گھوڑا کیسے ہو سکتا ہے.. لا شوں کو کھانے آیا ہے؟“

”نہیں.. ہے.. سچ مجھ کا گھوڑا ہے.. کان لگا کر سنو..“

تہہ خانے میں اترتی پہلی تین سیڑھیوں پر چاندنی بچھی تھی.. ان سب کی نظریں ان تین سیڑھیوں تک اٹھی ہوئی تھیں..

”اوپر کوئی نہیں..“

”ہے... میں نے خود سنائے..“

وہ کان لگائے اتنی دیر منتظر رہے کہ اوٹھنے لگے اور پھر ایک مدھم سی ہنہناہٹ تہہ خانے کی سینتیس سیڑھیاں اترتی ان کے کانوں تک آئی اور آتے آتے مزید مدھم ہو گئی..

”میں نے کہا تھا ان کہ ہے.. سنو.. اگر ہم اسے پکڑ لیں تو.. کھا سکتے ہیں..“

”کس کو؟“

”گھوڑے کو..“

”اگر یہ گھوڑا ہے تو..“

”اگر یہ گھوڑا نہیں گدھا ہے تو یہ کیسے ہنہنا سکتا ہے یو قوف.. گھوڑا ہے

اور اگر ہم اسے قابو کر کے تھے خانے میں لے آئیں تو اسے کھا سکتے ہیں“

”گھوڑا حلال ہوتا ہے؟“

”اگر نہیں بھی ہوتا تو کیا تم نہیں کھاؤ گے..“

”کھاؤں گا...“

”تم بتاؤ عبد الوہاب خاد میں حرمین شریفین.. تم سے بہتر حلال اور حرام

کی تیز کے ہو سکتی ہے ہم تو تمہارے پیروکار ہیں..“

”مکروہ ہے.. لیکن حرام نہیں.. کھایا جا سکتا ہے“

”مجھے بھوک نہیں.. پیاس لگی ہے“

”تو اللہ بخش تم جاؤ اپنی نانی جان رحمت بی بی کے پاس اگر تمہیں پیاس

تگ کرتی ہے تو..“

”نہیں بھائی مرتضی اب یہ حرబہ کام نہیں کرتا.. میں اتنی بار خیال ہی

خیال میں اپنی نانی جان کے پاس گیا ہوں کہ گرمیوں کے روزے ہیں پیاس سے میرا

جُشہ کیکر کا کامنا ہو رہا ہے اور وہ دوسری میں چھلکے اُتارے بادام گھوٹ رہی ہیں.. پھر ان

میں دودھ ملاتی ہیں اور ابھی سورج سر پر ہے اور وہ کہتی ہیں اللہ بخش پُتُر تو ابھی

بال ہے.. تیرا روزہ آدھا ہے اس لیے کھول لے.. میں تانبے کا بھاری گلاس منہ

سے لگا کر دودھیا گاڑھاد دو دھ غٹ پی جاتا ہوں اور میرا حلق مٹھنڈا ہرا ہو جاتا

ہے.. پر اب یہ حرబہ بیکار ہو گا یا ہے.. کام نہیں کرتا.. پہلے خیال ہی خیال میں

پیاس بجھ جاتی تھی اور میں اس نامراد تھے خانے میں بھوک پیاس نانی جان کے ہاتھوں

کا بنایا ہوا دو دھ اپنے حلق میں اترتا محسوس کر لیتا تھا.. لیکن اب نہیں.. میرا جُشہ کیکر

کے کانٹوں سے بھرا رہتا ہے.. پیاس مجھے خشک کرتی ہے..“

”یہ پیاس بھی بجھ سکتی ہے“
”کیسے بھائی مر تھی؟“

”گھوڑے کا خون بھی تو پیا جا سکتا ہے..“

”خون تو حرام ہوتا ہے...“

”نہیں پیو گے؟“

”پیوں گا..“

”تو پھر گھوڑے کو پکڑو... آؤ ہاشم میر...“

”مجھ میں سکت نہیں مر تھی بیگ.. میرا بازو بہت سوچ گیا ہے.. اس میں

ٹوٹی ہوئی ڈیلوں کی کرچیاں ہیں اور وہ.. ذرا سا بھی حرکت کرتا ہوں تو میرے
گوشت میں کھستی چینیں نکال دیتی ہیں.. بلا نہیں جاتا..“

”تم تو وہ کیا کہتے ہیں غیور پٹھان ہو گل شیر ولی... تمہارے سامنے ایک
گھوڑا کیا شے ہے خاناں.. آؤ..“

”تم پر تودل اور جان قربان کر دیں مر تھی.. پر کیا کریں جان بہت اذیت
میں پڑا ہے.. اس مادر چوڑیزی کٹر بم کا زہر آکو لوہا میرے معدے کے آس پاس
جا کر کہیں نٹھر گیا ہے اور میرے پاخانے کا نکاس نہیں ہو رہا یا را.. اور میں پچھلے
تین دن سے وہ سب کچھ اپنے اندر لیے بیٹھا ہوں جو باہر آنا ہوتا ہے اور وہ نہیں
آ رہا.. غلاظت کو سنبھالے بیٹھا ہوں یارا.. باقی زخم و خم کا تو خیر ہے پر یہ عجیب خانہ
خراب مصیبت لگا ہے.. گھوڑا کھائے گا تو اور بوجھ پڑے گا لیکن چلے گا تمہارے
ساتھ..“

”جانی...“

جانی کراہ رہا تھا اور امریکی لمحے میں کراہ رہا تھا..

”عبد الحمید جان واکر... تمہیں بھی آنا ہو گا..“

”میں.. گھوڑے کو.. کسی بھی گھوڑے کو.. مار نہیں سکتا..“

”اے پکڑنا ہے اوپر جا کر.. وہ قلعہ جنگی کے کچے صحن کی چاندنی میں کہیں ہنہنایا تھا..“

”پکڑنے کے بعد تو مارنا ہے.. آئی کیناٹ کل اے ہارس.. نو میشو دہاٹ.. آئی کیناٹ.. سوری!“

”تمہارا خیال ہے میں گھوڑے کو اپنے لیے پکڑنا چاہتا ہوں ڈیم اٹ..“
مرتضی نے اپنی مردہ نقابت میں سے چیخ کر کہا ”مجھے گھوڑے پکڑنے کا شوق ہے؟..
بھوک اور پیاس کی اور ادھڑے ہوئے.. اور ڈیزی کٹر اور بنکر بسٹر ز کی آہنی
کر چبوں سے ادھڑے ہوئے بد نوں کی تین راتیں اور تین دن بہت ہوتے ہیں..
لاشوں میں بدل جانے کے لیے.. اور اگر ہم ڈھیٹ ہو چکے ہیں مرنے سے انکاری
ہو رہے ہیں تو ہمیں زندہ رہنے کے لیے اس گھوڑے کو پکڑنا ہو گا.. ہم سب کو اوپر
جانا ہو گا.. کیا تم مستنت ہو؟.. ہم سب کو.. یہ سینتیس سیڑھیاں چڑھ کر قلعہ جنگی کے
نامراڈ کچے کپکاوٹڈ میں جانا ہو گا..“

”کیا پتہ وہ وہاں ہو...“

”نہیں ابو طالب پی پی.. وہاں کوئی بھی نہیں.. ان کے لیے ہم سب
مر چکے ہیں اگر انہیں ذرہ برابر بھی شک ہوتا کہ ہم ابھی تک یہاں سانس لے
رہے ہیں تو وہ ہمیں کب کافناک رکھے ہوتے.. اوپر اُس وسیع کے میدان میں سوائے
سینکڑوں لاشوں کے اور چاندنی کے.. اور کچھ نہیں.. اوپر ان سینتیس سیڑھیوں
کے اوپر قلعہ جنگی کی پستہ قد کچھ فیصلوں میں گھرے صحن میں کوئی نہیں.. صحن کی
مئی میں لتحری ہوئی کچھ سر بریدہ کچھ سر سلامت سینکڑوں.. چاندنی میں نہائی..
لاشوں کے سوا اور کوئی نہیں.. ان کا غستال چاند ہے.. تو ابو طالب اُس اپنے ایر
قبرستان میں کون آئے گا..“

”بھائی جی..“ اللہ بخش نے منہ کھول کر پہلے ”آہو“ کہا اور پھر بولا ”آج جعرات تو نہیں..“

”انی..“ عبد الوہاب ال غامدی کے ہنسنے کی آواز آئی ”اس تھہ خانے میں تورات، ہی رات ہے.. تو پھر جعرات بھی ہو سکتی ہے.. اللہ بخش اگر آج جعرات ہو تو کیا ہو..“

”بس عربی بھائی جی خیال ہی خیال میں میرے ذہن میں خیال آگیا کہ ہمارے گاؤں کے قبرستان میں.. بڑے جو ہٹر کے پار چوہدری منور کے مالک کے باغوں کے برابر میں جو قبرستان ہے جاث برادری کا.. جہاں کمیں ہم جیسا مر جائے تو اس کی قبر کناروں پر بنتی ہے اور چوہدری لوگ درمیان میں دفن ہوتے ہیں وہاں سروٹوں سے پرے.. ویرانے میں.. جہاں صرف سانپ، نیولے اور چر سی رہتے ہیں وہاں ہر جعرات کو ہر دوسری قبر پر دیئے جلتے ہیں.. موم بتیاں اور اگر بتیاں روشنی کرتی ہیں.. تو یہ نہ ہو کہ آج جعرات ہو اور اوپر قلعہ جنگی کے دیہرے میں پڑی لاشوں کے قبرستان میں دیئے جلتے ہوں، موم بتیاں روشن ہوں اور ہم باہر نکلیں تو پہچانے جائیں پکڑے جائیں“

”دیئے جلانے کون آئے گا یو توف..“ مرتضیٰ کا لہجہ بے حد درشت تھا ”مردوں اور لashوں میں فرق ہوتا ہے اللہ بخش.. مردوں کو اعزاز ملتا ہے کفن اور کافور کا.. نہلائی دھلائی اور فاتحہ کا.. کندھوں پر انھائے جانے.. کلمہ شہادت.. آہ وزاری اور بین کا.. اور ایک قبر ملتی ہے اور بند کفن کھول کر ان کا چہرہ کعبے کی جانب کیا جاتا ہے مٹی ڈالنے سے پہلے.. تو ایسے مردوں کے سر ہانے جعراتوں کو چراغ جلتے ہیں.. ہمارے اوپر قلعہ جنگی کے میلے پر جو سینکڑوں لashیں پڑی ہیں انہیں صرف چاندنی ڈھکتی ہے اور ان کے چہرے.. کچھ تو الگ ہو چکے ہیں اور جو ابھی تک جڑے ہوئے ہیں ان کا منہ کعبے شریف کی جانب نہیں ہے.. تو ایسی

لاوارث لاشوں کی کوئی جمعرات نہیں ہوتی..”

”اگر ہوتی تو بھی ہم دیئے جلانے والوں میں سے نہیں ہیں ..“
عبدالوہاب کی ناگوار آواز آئی .. ”یہ شرک ہے... جو مر گیا سو مر گیا.. چاہے وہ
فاطمہ ہو یا عثمان ..“

”گھوڑا چلا جائے گا“

تہہ خانے میں سے بلند ہونے والی سینتیس سٹریوں کے اوپر قلعہ جنگی
کے چاندنی آلو دیکھنے میں جو چانور تھا شام اس نے یہ فقرہ سننا اور اپنی موجودگی
کی برقراری ثابت کرنے کے لیے ایک مرتبہ پھر ہنھنایا..
”وہ ابھی تک وہاں ہے ..“

وہ اٹھے ..

کیسے اٹھے .. یہ تو وہی جانتے تھے .. پیپ سے رستے بدن کو مردہ کرتے
زخموں .. ہڈیوں کی کرچیوں کی کھبن برداشت کرتے .. بدن میں آرام کرتے
ڈیزی کثر کے لو ہے .. بنکر بستر کے ٹکڑوں .. تین دن اور تین راتوں کی نڈھال
بھوک اور پیاس کو سہارتے جانے کیسے اٹھے .. مگر اٹھے ..

تیسرا سٹری ہسپی پر جو چاندنی تھی جبکہ ہوئی اُتری ہوئی تھی اُس کو نظر میں رکھتے
ہوئے ... روز حشر قبروں سے اٹھنے والوں کی مانند اپنی ہڈیاں سمیٹتے اٹھے ..

”جانی ...“ عبد الوہاب نے اٹھتے ہوئے جان واکر کو ڈانٹ پلانی ”تم اپنی
کلاشکوف کے بوجھ سے گرتے جا رہے ہو .. اسے کیوں ساتھ لارہے ہو .. اوپر تو
کوئی نہیں .. چاندنی کو شوت کرو گے؟“

”عبدالوہاب پچھلے ایک برس سے یہ متواتر میرے بدن سے جڑی ہوئی
ہے۔ میری انگلیاں اس کے ٹرگر کے ساتھ پیدا ہوئی تھیں اور میری کمر کے اوپر جو
حصہ ہے وہ اس کے بوجھ سے نیلا پڑ گیا ہے .. میں تو .. پچھلے ایک برس سے اس سے

الگ نہیں ہوا.. سُٹ بھی کرتا ہوں تو یہ میرے ساتھ ہوتی ہے.. ہم دونوں سیامی جڑواں بنچے ہیں الگ الگ نہیں ہو سکتے.. اس کا پیوند میرے بدن میں جڑیں پکڑ چکا ہے.. ”

جانی ساتویں سیڑھی تک رینگتا گھستا پہنچا اور جیسے اُس کی سکت خلاص ہو گئی اور وہ ڈھیر ہو گیا.. گیارہویں تک اللہ بخش گیا اور گر گیا.. عبد الوہاب انیسویں سیڑھی پر پہنچ کر ہمت ہار گیا لیکن پچی پچی بیسویں تک جا پہنچا..
کل سینتیس سیڑھیاں تھیں..

ہاشم اور گل شیر ولی بھی کہیں گرے ہوئے تھے.. مرتضی کا کچھ پتہ نہ تھا.. وہ اس قابل نہ تھے کہ حرکت کر سکیں اور سیڑھیوں پر چڑھنے کی کوشش میں وہ اپنی پچی کچھ تو انائی گناہ بیٹھے تھے.. انہوں نے اپنے اپنے مقام سے حرکت کر کے غلطی کی تھی.. کچھ زخم کھل گئے تھے اور ٹوٹی ہوئی ہڈیاں ماس میں گھری ہو گئی تھیں... تین دن سے بھوکے اور پیاس سے ماس میں میخوں کی ماند اُز کر انہیں مصلوب کر رہی تھیں..

وہ اس مکمل مسماں شدہ حالت میں بہت دیر پڑے رہے..
تب تک جب تک چاندنی تیسری سیڑھی سے سُٹ کر پہلے سیڑھی تک واپس نہ چلی گئی..

جتنے وقفے میں چاندنی تیسری سیڑھی سے پہلی سیڑھی تک اٹھتی ہے اتنے عرصے میں ان کے نیم مردہ بدنوں نے تھوڑی سی تو انائی جمع کر لی..

”پچی پچی...“

”ہاں اللہ بخش...“

”یار میرے حلق میں نوکھا پھیل گیا ہے.. دراڑیں پڑ گئی ہیں.. مجھے پیاس مارتی ہے“

”تم اپنی نانی جان کے پاس نہیں گئے تھے..“

” بتایا تو ہے کہ وہ حربہ کام نہیں کرتا بھائی چی پھی .. تمہارے چیجنیا میں بڑے ندی نالے اور نہریں ہوں گی پانی سے بھری ہوئی .. ہیں؟ مخندذی ٹھار .. سینے میں مخندڈاں دینے والی .. ہم ادھر سے فارغ ہو کر تمہارے لئے چلیں گے چی پھی ..“

”ہم ادھر سے کبھی فارغ نہیں ہوں گے اللہ بخش ..“

” خیال ہی خیال میں .. نہیں “

” ہاں ..“

” بھائی .. حسینؑ کی پیاس اس سے زیادہ تھی ..؟“

” عقیدہ پیاس کو بڑھاتا ہے .. اُس کا تو مول پڑ گیا .. ہماری پیاس تو رائیگاں جائے گی .. اُنھوں .. ہمت کرو .. گھوڑا چلا جائے گا ..“

اور جب وہ ہمت کر کے دوبارہ اُٹھئے، اپنی نیم مردہ ہڈیوں کو گھستنے سینتیسویں سیرھی کے اوپر پہنچے تو واقعی گھوڑا جا چکا تھا ..

لیکن انہوں نے پہنچلے تین روز کے بعد پہلی بار اپنے سامنے قلعہ جنگی کے وسیع صحن کو دیکھا جس پر چاندنی کی بے مہر کرنیں اُترتی تھیں ..

ایک سکوت تھا .. ہرشے پر .. اور ہرشے سے مراد ہر لاش تھی ..

یقیناً آج جمعرات نہیں تھی ورنہ ہر لاش کے سرہانے دیئے جل رہے ہوتے .. صرف چاندنی جلتی تھی .. اور قلعہ جنگی کے کچے چوکور صحن کی وسعت کو بھرتی .. ہر لاش کو نمایاں کرتی .. ہر لاش کے برابر میں اُس کا سایہ ذاتی چاندنی تھی .. اور بُو تھی .. جو بُھرتی نہ تھی .. ہوا کے دوش پر سوار آتی تھی اور ان کے نہنخوں کو سکڑنے پر مجبور کرتی .. حلق سے اُبکائیاں اُبالتی تھی اور گزر جاتی تھی ..

آن میں کوئی بھی قابل شناخت نہ رہا تھا ..

آن میں سے بیشتر کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور وہ اوندھے

پڑے خاک چاٹتے تھے..

وہ چند ایک جن کے جزوں کے اندر سونے کا ایک آدھ دانت ہاؤں
کے دہانے پھٹ چکے تھے..

کہیں کوئی ایک نانگ اٹھی ہوئی لگتی تھی جیسے گھرو اپسی کے لیے سفر کا
آغاز کرنا چاہتی ہوا اور کہیں ایک ہاتھ فضامیں بلند اکڑا ہوا.. جیسے اب بھی اپنا دفاع
کرنا چاہتا ہو.. جن کے بُٹ اور جاگرنے اور کار آمد تھے اُن کے مردہ پاؤں انہیں
کھو چکے تھے.. کسی بھی لالاش کے گلے میں گرم مفلر نہیں تھا کیونکہ اسے آسانی سے
اتارا جاسکتا ہے اور وہ ایک زندہ گلے کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے..

لاشوں کا ایک بے انت صحراء تھا.. جیسے ایک وسیع کھیت میں جگہ جگہ
مینڈھیں اُبھری ہوئی ہوں.. اُن میں سے بیشتر اور وہ سینکڑوں کی تعداد میں
تھیں.. ادھری ہوئی کئی پھٹی حالت میں پڑی تھیں جیسے کسی بے رحم سرجن نے اُن کا
بوسٹ مارٹم کر کے انہیں پھینک دیا ہو..

پچھے کی نانگیں اور پچھے کے کمر سے اوپر والے دھڑ مٹی میں دفن تھے..
جیسے وہ ریت میں کھلتے بچتے تھے.. چھپن چھپائی کھلتے اپنی نانگیں چھپاتے تھے اپنے
چہرے روپوش کرتے تھے..

انہیں انسانی ہاتھوں نے نہیں.. بی۔ باون طیاروں نے نیم دفن کیا تھا..
صحن میں جگہ جگہ گھرے گڑھے تھے جیسے وہاں مٹی کے آتش فشاں اُمل
کر ٹھنڈے ہو گئے ہوں.. ایسے گڑھے تخلیق کرنا صرف ڈیزی کڑا یے منی ایتم بم
اور بنکر بسٹر ز کے بس کی بات تھی..

ان یو تو ف لاشوں نے قدوز سے مزار شریف تک کا طویل صحرائی سفر
صرف اس لیے کیا تھا کہ وہ اپنے ہتھیار رکھ کر قدمدار کی جانب نکل جائیں.. اور
جان سے نہ جائیں.. کہ یہی طے ہوا تھا..

ایک عجیب شہر خاموش اُن کے سامنے چاندنی میں آباد تھا..
وہ بھول گئے کہ تھے خانے کی سینتیں سیڑھیاں طے کر کے وہ اوپر کیوں اور
کس مقصد کے لیے آئے ہیں..

قلعہ جنگلی کی کچی پستہ قد فصیلوں میں گھری چاندنی رات میں.. وہ بھول
گئے کہ وہ اوپر.. یہاں.. جہاں شمال کی نشاخی اور گورے کمانڈو اُن کی تاک میں
ہو سکتے تھے وہ کیوں آئے.. اس لیے کہ اُن کے سامنے عالم مثال کا ایک اوپن ایئر
کبرستان تھا..

ہر لالاش ایک قیاس میں تھی.. مٹی سے بھری.. شائد سر بریدہ مگر پھر بھی
ایک کامل تصور میں تھی..

جہالت میں تھی اور پھر بھی ایک مثالی تصوری.. ایک ناقابل حصول
نصب العین کی خواہش میں خاک ہوتی تھی.. ایک ایسے پختہ عقیدے میں گم نبو
دیتی تھی جو کہ خارجی عالم خیال کا عکس اور دھوکا تھا...
اور اس کا کوئی وجود نہ تھا..

یہ تصوریت تھی.. مثالیت تھی..
دنیا کو ایک مثالی شکل میں دیکھنے کی تمنا تھی جو قلعہ جنگلی کے دھول
بھرے صحن میں ہر لالاش کے منہ کھلے چہرے پر چاندنی میں عیاں ہوتی تھی.. تمنا کا
دوسرा قدم انہیں یہاں تک لے آیا تھا..

تمنا کا دوسرا قدم انہانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی کہ یہ ہمیشہ فنا کی
وادی میں لے جاتا ہے.. کسی نہ کسی قلعہ جنگلی کے صحن میں آپ کو مردہ کر دیتا ہے..
اس تصور کامل کی تمنا کا کوئی جواز نہیں ہوتا.. کیونکہ عقل.. بالائے بام
محوتا شہ رہنے کے لیے ہوتی ہے..

تو گویا آج جھرات نہ تھی اور کسی کا سئہ سر کے سرہانے کوئی چرا غنہ جلتا

تھا.. صرف چاندنی تھی جو جلتی تھی اور تمبا کا دوسرا قدم اٹھانے والوں کے مسخ شدہ چپروں کو عیاں کرتی تھی..

لاشوں کی رکاوٹ میں انگتی.. چاندنی کے سکوت پر سوار.. کہیں سے..
دور سے.. ایک ہلکی سی ہنہناہٹ کی آواز آئی..

وہ یکدم اُس تصور کامل کے سحر میں سے باہر آگئے.. چونک گئے.. ان کے
کان کھڑے ہو گئے.. وہ بھول گئے تھے لیکن انہیں یاد آگیا کہ وہ یہاں کیوں آئے
تھے..

”گھوڑا بھی تک یہاں ہے..“ ہاشم میر نے سرگوشی کی..
”کہاں ہے؟“

”تم نے اُس کو نہیں سنایا..“

”نہیں.. میں نے کچھ نہیں سنایا..“

”وہ ہے..“

”کہاں؟“

وہ سب پہلی بار چاندنی میں سیدھے کھڑے ہوئے.. اس سے پیشتر وہ
ڈرے ہوئے چوروں کی مانند کبرے ہو کر ادھر ادھر گھومتے.. چونکے ہو کر چلتے
تھے..

”ادھر دیکھو یارا..“ گل شیر نے اتنی بلند آواز میں کہا کہ وہ سب کے
سب دبک گئے کہ قلعہ جنگلی کی لاشوں پر ”ادھر دیکھو یارا.. ادھر دیکھو یارا“ کی
صداؤ گوئی خنے لگی.. لیکن اس صدا کو وہاں سennے والا کوئی نہ تھا..

”کدھر؟“ جانی نے جھک کر سرگوشی کی..

”ادھر..“

”گھوڑا لانگڑا رہا تھا..“

وہ پھر ہنہنا ہٹ میں زور نہ تھا..
 شام دوہ بھی ان کی مانند کئی روز سے بھوکا تھا۔ فصیل کے قریب.. ان
 سے بہت فاصلے پر.. وہ ہر لاش کے پاس رکتا.. اُس کے چہرے کو چاٹتا۔ اور جسے
 ہوئے سخت خون کو چاٹ کر اپنی پیاس بجھانا چاہتا۔ اور پھر مايوسی سے ہنہنا کرذرا
 آگے ہو جاتا..

قلعہ جنگی پر اترنی چاند رات میں ... جب کہ چند کلو میٹر پرے
 مزار شریف کے دھنڈ لئے میں سے روشنیاں ابھرتی اور ایک بستی میں زندگی کی نوید
 دیتی تھیں.. ایک لنگڑا تھا ہوا گھوڑا اپنے حسینؑ کو تلاش کرتا تھا.. ہر لاش پر گردن
 جھکاتا تھا اُسے سو گھنٹا تھا لیکن اُسے شناخت نہیں کر پاتا تھا کیونکہ چہرے مسخ ہو چکے
 تھے، دھوپ اور موت نے ان کی رنگت سیاہ کر دی تھی اگرچہ وہ سب کے سب سیاہ
 رنگت والے نہیں تھے.. سیاہ فام گورے، بھورے اور زرد رنگتوں والے تھے لیکن
 موت کی سیاہی نے رنگ و نسل کو مٹا کر ان میں دھول بھر دی تھی.. امتیاز مٹا دیا تھا
 اور وہ پہچان کے جہاں سے دور جا چکے تھے..

گھوڑا ان میں سے اپنے سوار کو کیسے پہچان سکتا تھا..
 سوار اگر کیجا ہو.. مجتمع ہو تبھی اُس کی پہچان ہو سکتی ہے لیکن ان میں سے
 بیشتر تو بکھرے پڑے تھے.. ان کے اعضاء ایک دوسرے سے روٹھے ہوئے دور
 دور پڑے تھے.. بازو کہیں ہتھیلیاں پھیلائے پڑے ہیں اور دھڑکا ایک حصہ کہیں
 اور گل سڑ رہا ہے.. اور جو سر.. سر بلند نہیں ہو سکتا وہ کسی کچھ دیوار سے ملک
 لگائے لاٹکنے سے بچتا ہے.. بی۔ باون طیاروں نے کیا خوب ان کی تقسیم کی تھی..
 تو پھر ایک ناتواں بھوکا پیاسا اور لنگڑا گھوڑا ان بکھرے ہوئے اعضاء کو کیسے جمع
 کر کے پھر جوڑ کر ان میں سے اپنے سوار کو کیسے پہچان سکتا تھا..
 گھوڑا ان کے زیر زمین ٹھکانے میں سے اٹھتی اور قلعہ جنگی کے صحن

میں اختتام کو پہنچتی سنتیں سڑھیوں سے بہت پرے.. قلعے کی کچی فصیل کے سائے میں ایک لاش کو بہت دیر سے سونگھ رہا تھا..
”چلو..“

”نہیں عبدالوہاب.. ہم ابھی تک ایک کوٹھری کے سائے میں پوشیدہ ہیں.. چاندنی میں نہیں گئے.. یہاں سے وہاں تک.. کچی فصیل تک پہنچنے کے لیے ہمیں اس سائے میں سے نکل کر کھلی چاندنی میں اپنے آپ کو ظاہر کر دینا ہو گا اور وہ.. ہمیں دیکھ لیں گے..“

”وہ.. یہاں نہیں ہیں ہاشم.. لاشوں کا کوئی چوکیدار نہیں ہوتا کیونکہ وہ فرار نہیں ہو سکتیں.. ان کے لیے ہم کب کے لاشیں ہو چکے ہیں اس لیے وہ صحن کے آس پاس کہیں نہیں ہو سکتے.. ہاں فصیل کے نشیب میں شائد وہ ہوں.. ویسے کیا فرق پڑتا ہے اگر وہ ہیں یا نہیں.. ہم نے بہر حال ان لاشوں میں.. بہر حال شامل ہونا ہے.. چلو.. گھوڑے کو قابو کرو..“

وہ سائے میں سے برآمد ہو کر چاندنی میں بڑھنے ہو گئے.. یہ کچی اور کھری چاندنی نہ تھی اس کی خصلت میں مکر تھا.. اس کی کرنوں میں فریب تھا.. روشنی میں مکاری تھی.. وہ جان بوجھ کر انہیں ضرورت سے زیادہ عیاں کرتی تھی اتنا عیاں کرتی تھی کہ بُنخ کے کھنڈروں میں برا جمان بوجھا آتش پرست ان کے سائے اپنے سامنے جلتی آگ میں لرزائ دیکھ سکتا تھا..

اس عیار اور دھو کے باز چاندنی میں وہ جھکے ہوئے.. کہڑے ہو کر کارٹوں کرداروں کی مانند مزاحیہ انداز میں اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش میں جھکے جھکے گھوڑے کی جانب چلنے لگے.. تازہ.. کھلی اور بے در لبغ ہوا ایک مدت کے بعد ان کے بدنوں کو چھوٹی ہوئی نکلی تو اس کی تازگی نے ہڈیوں کی کرچیوں کو شیکھا اور اذیت ناک کر دیا.. اور ان کی چھین نے ٹیسوں کو آسمان تک پہنچایا اور برداشت

سے باہر بھوک کالا غرپن اُن کے خشک ہوتے دماغوں میں لڑھنے لگا۔
وہ جب بھی گرتے.. کسی لاش پر گرتے..
راستے میں رکاوٹیں بہت تھیں..

قلعہ جنگی کے کھیت میں مینڈھیں ہر جگہ تھیں..

جب بھی ٹھوکر کھاتے وہ کسی لاش سے ٹھوکر کھاتے.. وہ دیکھ کر نہیں
چلتے تھے.. نہ ہی دیکھا جاسکتا تھا.. اگر دیکھ سکتے تو بھی راستے میں پڑتی اکڑتی لاشوں
کے درمیان پاؤں دھرنے کی جگہ کم تھی.. اس لیے وہ چلتے تھے تو لاشوں پر قدم
رکھتے چلتے تھے..

”میرا خیال ہے وہ شیر محمد تھا...“ اللہ بخش نے جھکے جھکے چلتے مرتفقی کے
قریب ہو کر سرگوشی کی.. اور وہ چاندنی شام کا نئے اندر ہائی فائی سپیکر رکھتی تھی جس
نے اُس کی سرگوشی کو بلند کر کے پورے قلعہ جنگی پر پھیلا دیا اور... میرا خیال ہے وہ
شیر محمد تھا.. شیر محمد تھا.. ہر سو گوئے بنخے لگا..

”کون شیر محمد تھا؟“

”جس پر میں ابھی ابھی گرا تھا.. منہ بھار گرا ہوں تو اُس کے چہرے پر
جالگا ہوں.. اکڑا ہوا ٹھنڈا برف تھا یہاں تک کہ اُس کی نزوئی پہلی داڑھی کے زم
بال بھی کانٹے ہو رہے تھے... سردی سے جم گئے تھے.. مجھے شک پڑا کہ وہ شیر محمد
ہے..“

”ہو گا...“

”میرا خیال ہے کہ وہی تھا.. اگر وہی تھا تو مجھے تھوڑی دیر اُس کے پاس
بیٹھنا چاہیے تھا اُس سے افسوس کرنا چاہیے تھا..“

”مرے ہوئے بندے سے تم نے افسوس کرنا تھا..“

”آہ ہو بھائی مرتفقی.. اب اُس کے مرنے کا افسوس کس سے کریں.. اُس

سے کر لیتے..”

”اللہ بخش خاموش رہو.. پچکے سے چلتے رہو..“

”اُس کا ایک بھائی کشمیر میں شہید ہو گیا تھا.. اُس کی لاش گاؤں پہنچی تو اُس کے باپ نے برادری کو روئے سے منع کر دیا اور کہا یہ بیٹا تو کیا میں اپنے چھوٹے بیٹے کو بھی جہاد پر روانہ کروں گا اور اُس کی شہادت کی دعا کروں گا.. لگتا ہے اُس کے باپ کی دعا قبول ہو گئی..“

”لیکن وہ یہاں آنا نہیں چاہتا تھا.. باپ کی خوشی کے لیے آگیا تھا.. نہ مکھ تھا سیاہ گپڑی کے نیچے بھی اُس کی آنکھیں مسکراتی رہتی تھیں.. کیا واقعی وہ شیر محمد تھا؟“

”اُس کی ناک سیدھی اور تیز تھی.. گجرات کے لوگوں کی ناکیں اوپھی اور نیکھی ہوتی ہیں.. مجھے لگا کہ اُس کی ناک تھی..“

”تم نے صرف ناک سے اندازہ لگایا کہ وہ شیر محمد تھا؟.. سردی اور موت میں تین دن پرانی سب لاشوں کی ناکیں سیدھی اور نیکھی ہو جاتی ہیں..“
کبرے ہو کر چلتے.. ٹھوکروں سے بچتے.. کچی فصیل کو نظر میں رکھتے چلتے انہیں بہت دیر ہو گئی تھی..

وہاں واقعی کوئی ذی روح نہ تھا..

اگر کوئی ایک بھی ہوتا تو قلعہ جنگی کے کچے صحن پر پھیلی مکر چاندنی کو فریب دینے کی کوشش میں بتلا اُن جھکے جھکے.. کارٹون کرداروں کی مانند جھکے جھکے اجسام کو واضح طور پر دیکھ لیتا..

گھوڑے کے نہنؤں نے اُن کی قربت سے بہت پہلے اُن کی موجودگی محسوس کر لی اور اُس کے کان چوکنے ہو گئے.. وہ کھلی چاندنی میں نہ تھا فصیل کے سامنے میں کھڑا تھا..

وہ قریب ہوئے تو گھوڑے نے سر انھیاں۔ اُس کی تھوڑتھوڑی پر جمے ہوئے خون کی پڑیاں چمٹی ہوئی تھیں اور اُس کی آنکھیں مردہ تھیں.. مردوں کو دیکھ دیکھ کر اُس کی آنکھیں مردہ ہو چکی تھیں..

اُس کی بائیں گردان سے لشکی مٹی کو چھوڑی تھیں..

وہ رک گئے..

گھوڑا سر انھائے انہیں بغیر کسی رد عمل کے مردہ آنکھوں سے سکتا رہا..

”ٹھہر و..“ جانی پیچھے رہ گیا تھا.. وہ لنگڑاتا ہوا ان کے پاس پہنچا.. اور رُک گیا.. وہ سب دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن جانی کی آنکھوں میں ایک عجیب سی اُفت اور آسودگی آئی جب اُس نے گھوڑے پر نظر ڈالی.. اُس کے چہرے سے بھوک کی نقاہت زائل ہو گئی اور وہ تروتازہ دکھائی دینے لگا.. وہ لنگڑاتا ہوا آگے ہوا.. اور گھوڑے کی پشت پر ایک ہلکی سی تھکلی دی ”.. ہو ہو..“ اُس نے زیر لب کہا.. پشت کے ماں میں اس لس سے ایک ٹھرٹھراہٹ تیری اور وہ تھوڑتھوڑی انھا کر ہنہنایا... ای ہی ہی ..

دم بخود چاندنی نے اُس کی ہنہنابہث کو بھی دوچند کر کے قلعہ جنگی کے پورے صحن پر نشر کر دیا..

”جانی.. گھوڑے کو مت تھکو..“

”مجھے گھوڑوں کے بارے میں مت بتاؤ..“ جانی نے گھوڑے کی پشت پر سے ہتھیلی انھائے بغیر غصے سے کہا ”میں بچپن سے گھوڑوں کے ساتھ کھیلتا آیا ہوں.. امریکہ میں میرا اپنا.. ایک ذاتی پونی تھا.. براوئی.. میں گھوڑوں کو جانتا ہوں..“

”تم رائڈنگ آؤٹ فٹ میں مبوس امریکہ کے سبزہ زاروں میں ڈلکی چلتے گھریلو قسم کے گھوڑوں کو جانتے ہو جانی..“

”گھوڑے ہر جگہ گھوڑے ہوتے ہیں ..“
 ”نہیں .. قلعہ جنگی کے اوپر ایر قبرستان میں لاشوں کو چاٹتے گھوڑے
 کچھ اور ہوتے ہیں ..“

”شٹاپ ہاشم میر .. اور مجھے پلیز ڈسٹر بند کرو میں اس جانور کو جاننا
 چاہتا ہوں .. یہ میرے براوئی سے مختلف نہیں ہو سکتا ..“
 جب کہ جانی .. جان واکر عبد الحمید سلمان الفارسی .. گھوڑے کی پشت کو
 آہستہ آہستہ پیار سے سہلا تھا وہ رینگتے ہوئے ایک تجسس میں بتلا کچی فصیل میں
 ہتھیار جمانے کے لیے جو رخنے اور محابیں تھیں ان تک چلے گئے ..
 گھوڑا جانی کی سپرداری میں تھا اور وہ مجسس تھے کہ فصیل کے پار اس
 سے کیا دھکائی دے رہا ہے ..

جہاں وہ تھے قلعہ جنگی میں .. یہ حصار مزار شریف کے شہر سے کچھ فاصلے
 پر ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان ایک بلند سطح پر پھیلا ہوا تھا ..
 انہوں نے قریب ہو کر رخنوں اور محابوں سے اپنی آنکھیں لگائیں تو
 مزار شریف کی روشنیاں صحرائے سراب .. جھملاتی .. مکر چاندنی میں سرات کرتیں
 ان تک آئیں .. اور ان میں روشنی کا جو سب سے بڑا گھنکھنا تھا وہ اُس شاندار نیلی
 انیشوں والی گنبدوں میں اُبھری ہوئی عمارت میں سے جنم لیتا تھا جس کے بارے
 میں روایت تھی کہ وہ حضرت علیؑ کا مرقد ہے .. اور اس روایت نے ایک خواب
 سے جنم لیا .. کہا جاتا تھا کہ بخششہر جو مولانا زوم کی جنم بھومی تھا وہاں کے ایک
 پارسا کو کئی راتوں تک مسلسل ایک خواب میں حضرت علیؑ بخش سے کچھ فاصلے پر اپنی
 آخری آرام گاہ کی نشاندہی کرتے رہے .. اور جب اُس مقام پر کھدائی کی گئی تو
 وہاں سے حضرت علیؑ کے ہاتھوں کا لکھا ہوا ایک قرآن پاک اور چند ہڈیاں برآمد
 ہوئیں اور پھر اُسی مقام پر اُن کا مزار تعمیر کیا گیا .. یہ مزار شریف خلق خدا کی توجہ

اور عقیدے کا محور ہوا اور یہاں اس بستی کا ظہور ہوا اور بُخن کا قدم شہر لاوارث ہو کر اجڑ گیا۔

رخنوں، محرابوں اور پکے قلعے کی برجیوں میں سے وہ اُس مزار کی عمارت سے اٹھنے والی روشنیوں کو تکتے تھے.. یہ روشنیاں طالبان نے گل کر دی تھیں کیونکہ وہ انہیں بدعت سمجھتے تھے..

جانی بدستور گھوڑے کی پیٹھ تھکتا اسے دلا سے دیتا تھا..

اور اس مزار شریف سے پرے جہاں بھی ہزاروں آتش کدے روشن ہوا کرتے تھے وہاں بُخن کے ہندُر تاریکی کی اتھاگہ رہائیوں میں گم تھے..

شاندیہ اُن کا واہمہ تھا.. اُن کا جو محرابوں اور رخنوں میں سے جھانکتے تھے کہ جدھر.. جس گنگ اور ناینا سیاہی کا ہندُر راج تھا وہاں اُدھر.. انہیں ایک شعلہ دکھائی دیتا تھا.. اُن سب کی آنکھوں میں وہ ایک واہمہ.. ایک شعلہ جو بُخن کے ہندُروں میں روشن تھا، بھڑکتا تھا.. اگرچہ یہ ممکنات میں بھی ممکن نہ تھا کہ وہاں ابھی تک زرتشت کی آگ جل رہی ہو..

اُس کا عقیدہ کچھ بھی ہو یا بے شک لامد ہب ہو.. ہر نفس کسی نہ کسی آگ کا پچاری ہوتا ہے.. اور اُس آگ میں جل مرننا چاہتا ہے.. اُس میں بھرم ہو کر رفتقوں تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے.. تصویر کامل تک!

آتش کدہ بُخن پر بے شک تاریکی حکمران تھی.. اتنی سیاہ کے اُس پر چاندنی بھی اثر نہ کرتی تھی لیکن قلعہ جنگی کے رخنوں اور محرابوں میں آنکھیں رکھنے والوں کو شابہ ہوتا تھا کہ وہاں آگ ہے!

”یارا عبد الوہاب.. اُدھر جو اتنا روشنی کا چکا چوند ہے مزار شریف میں تو یارا اس وقت اُدھر لوگ مزا کرتا ہے.. میلی ویرین دیکھتا ہے اور ریڈ یو سنتا ہے اور ناچتا گاتا ہم پر فتح کا جشن مناتا ہے.. ہم اگر یہاں سے نکل کر نیچے چلا جائے.. اپنی سیاہ

پکڑی اُتار کر.. تم ہم بھی مزا کر سکتا ہے.. زندہ سلامت رہ سکتا ہے.. کہ نہیں؟“
 ”نہیں گل شیر ولی.. ہم زندہ نہیں.. مر چکے ہیں.. دوبارہ زندہ نہیں
 ہو سکتے.. ہم اُن کے ہم وطن نہیں، غیر ہیں.. انہوں نے.. ہمارے طالبان اور
 شمال والوں نے پھر سے گھل مل جانا ہے.. لیکن یونچ جو مزار شریف کے شمالی ہیں وہ
 ہمیں معاف نہیں کر سکتے.. طالبان کو معاف کر دیں گے.. وہ ہمیں زیادہ ذمہ دار
 سمجھتے ہیں.. انہوں نے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ کر سر میں گولی مار کر غلاظت کے
 ڈھیروں پر چینک دیتا ہے کہ ہم وہ غیر لوگ تھے جو اپنے ملک چھوڑ کر اُن کے ملک
 میں اپنے خواب پورے کرنے آئے تھے..“

”انہوں نے ہمارے ساتھ مشاورت بھی نہیں کی.. ہمارے طالبان
 بھائیوں نے اور اپنے شمالیوں کے ساتھ قندوز کے بعد ہتھیار ڈال دینے کا معاملہ
 کر لیا..“ چی چی بولا اور اُس کے لبجھ میں کڑواہٹ تھی..“

”چی چی“ مرتضیٰ بیگ نے محراب سے آنکھیں ہٹا کر اُس کی جانب دیکھا
 لیکن وہ فصیل کے سائے میں تھا.. وہ نظر نہیں آرہا تھا“ چی چی ہم اُن کے لیے تو
 نہیں، اپنے لیے یہاں آئے تھے.. وہ ہم سے کیوں پوچھتے..“

”بھائی مرتضیٰ.. مجھے گھر یاد آتا ہے.. ماں یاد آتی ہے..“

”آخری وقت میں یہ سب کچھ یاد آیا کرتا ہے اللہ بخش“

”ہم جنت میں جائیں گے نا.. ہمیں مرنے کے بعد بھی رزق ملے گا

ناں؟“

”ہم جائیں گے تو شمال والے بھی ہمارے چیچے پیچے چلے آئیں گے.. وہ
 بھی تو ہماری طرح شریعت کے پابند ہیں، مسلمان ہیں.. ہاشم میر نے ایک شمالی پر
 فائر کیا اور پھر اُس کے نزدیک ہوا یہ جانے کے لیے کہ وہ مر چکا ہے یا نہیں تو اُس
 کی سفید داڑھی جو اُبلتے خون سے سرخ ہو رہی تھی اُس کے لبوں کے ساتھ ہل رہی

نہی اور وہ کلمہ پڑھ رہا تھا.. ”

”مجھے ڈر آ رہا ہے آئندہ سے .. میں گھر جانا چاہتا ہوں“

”ہمارا وہی گھر ہے .. وہ تہہ خانہ جس میں ہم اپنے آپ کو چھپائے ہوئے ہیں .. اور اگر ہم اُس گھوڑے کو جس کے ساتھ جانی لاڈ پیار کر رہا ہے تہہ خانے میں نہیں لے جاتے تو کل تک زمین کے رزق سے بے نیاز ہو جائیں گے اور آسمانوں کے رزق کا کیا پتہ ملتا ہے یا نہیں ملتا .. اس لیے دوچار دن کی زندگی کے لیے .. گھوڑے کو لے چلو .. آؤ!“

گھوڑا سدھایا جا چکا تھا .. جانی اُس کی پشت پر تھکی دیتا تھا تو وہ جواب میں تھوڑی اٹھا کر اپنی مسرت کا اظہار کرتا تھا ..

”اب بے شک اس کی بائیں تھام لو .. یہ تمہارے پیچھے پیچھے چلا آئے گا ..“ جانی نے ایک آخری تھکی دی تو گھوڑا ایک بار پھر ہنہنایا .. چاندنی کے سفید رتھ پر سوار اُس کی ہنہنائی شام کے آخری آتش پست کے سامنے جلتی آگ تک گئی اور اُس کے شعلے میں ایک نامعلوم سی لرزش نے جنم لیا ..

ہاشم نے آگے بڑھ کر اُس کی بائیں اٹھائیں اور اس سے پیشتر کہ وہ اُس کے تنہوں کو اذیت دیتیں وہ سر جھکا کر اُس کے پیچھے چلنے لگا .. لنگڑا تھا ہوا چلنے لگا .. وہ زخمی تھا .. اگر وہ صحت مند بھی ہوتا تو لاشوں کو ٹاپٹا انہیں ہر قدم پر اپنے سموں کے آگے پا کر جھجکتا .. لنگڑا ہی معلوم پڑتا ..

”وہ شیر محمد ہی تھا“ اُن کے عقب میں سے اللہ بخش کی آواز اُن تک آئی اور انہیں پہلی بار احساس ہوا کہ وہ اُن سے بہت پیچھے رہ گیا تھا ..

گھوڑے کی باگ ہاشم کی زخمی انگلیوں کو اذیت دے رہی تھی - شیر محمد کی آواز سن کر اس نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی .. وہ ایک ماہر ایتھلیٹ کی مانند لاشوں پر سے کو دتا .. اپنی نقاہت اور پیپ بھرے زخم فراموش کرتا بھاگتا ناپتا چلا آ رہا تھا ..